Al-Mahdi Research Journal (MRJ)
Vol 5 Issue 2 (Oct-Dec 2023)
ISSN (Online): 2789-4150
ISSN (Print): 2789-4142

The Poetry of Abdul Rasheed, the Founder of Prose poetry, and the Intellectual Horizons of Contemporary Urdu Poetry

نثری نظم کے بنیاد گزار نظم نگار عبد الرشید کی نظم نگاری اور جدید اُردو نظم کے فکری ابعاد

Dr. Nabeel Ahmad Nabeel
Associate Professor, Division of Islamic and Oriental Learning, University of Education, Lower Mall Campus, Lahore
drnabeelahmednabeel@gmail.com

Dr. Zahid Hussain Dashti
Lecturer, Department of Balochi, University of Balochistan, Quetta
zahiddashti29@gmail.com

Dr Aamra Rasool
Lecturer Urdu, Government Graduate Women College Dubai Mahal Road Bahawalpur

Abstract

Abdur Rasheed is a relatively unfamiliar name beyond Urdu literary circles. However, his body of work is something that Urdu literature, particularly modern Urdu poetry, can take pride in. Rasheed Sahib belonged to a generation of poets that followed immediately after stalwarts such as Rashid and Majeed Amjad. Abdur Rasheed not only continued the traditions established by the aforementioned poets but also brought a thematic freshness and modern sensibility to modern Urdu poetry. This infusion of contemporary elements was informed by Rasheed Sahib's direct

CC BY

engagement with English literature and his awareness of modern and post-modern trends in international literature. In this article, we take a fresh look at Abdur Rasheed's debut poetic volume, 'Inni Kuntum Minazzalmeen.' Rasheed Sahib's distinctive individuality as a poet and his invaluable contributions to the development of modern Urdu poetry are illuminated.

Keywords: Abdur Rasheed, Urdu poetry, Literary traditions, Thematic freshness, Contemporary sensibility

قیامِ پاکستان کے بعد جدید اُردو نظم کے ممتاز شعرا میں ن۔م۔راشد، میرا جی، عزیز حامد مدنی اور مجید امجد کے بعد کی نسل کے جن شعرا کا نام لیا جاتا ہے، اُن میں عبدالرشید کا نام نئی نظم کے میدانِ بے ذخّار میں خاص طور سے لائقِ اعتبار ہے۔ اُنھوں نے اپنی نئی نظم کے ذریعے اُردو کے قالب کو نئے موضوعات، نئے اسالیب، نئی تکنیک اور کئی ایک حوالوں سے نئی شعری فضا سے ہم کنار کیا ہے۔ عبدالرشید صاحب کا سالِ پیدایش ۴ جولائی ۱۹۴۵ء بہ مقام کوئٹہ ہے اور سال وفات ۲۲/ جون ۲۰۱۹ء بہ مقام لاہور ہے۔ اُنھوں نے اپنا بی۔اے کا امتحان ۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے پاس کیا اور پھر گورنمنٹ کالج، لاہور ہی سے انگریزی ادبیات میں ۱۹۶۶ء میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں سول سروسز کا امتحان پاس کیا اور انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے متعدد کالجز میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے اور اپنا تخلیقی سفر بھی جاری رکھا۔ دورانِ ملازمت وہ ساہیوال میں مجید امجد سے بھی ملتے رہے۔ عبدلرشید اُردو میں نئی نظم کے اُن معدوے چند شعرا میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے پوسٹ موڈرن مین کے مصائب و مسائل سے لے کر ہر طرح کے مابعد جدید موضوعات پر آزاد ہیئت اور نثری آہنگ میں متعدد نظمیں (بلینک ورس)، تخلیق کیں۔ اُن کے ایک درجن کے لگ بھگ نظموں کے مجموعے شایع ہو کر منصۂ شہود پر آئے۔ اُن کا شمار ن۔م۔راشد، میرا جی، مجید امجد اور اختر الایمان کے فوری بعد کے شعرا کی نسل سے بنتا ہے۔ کئی ایک لحاظ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبدالرشید کا شمار ن۔م۔راشد کے جونیئر معاصر شعرا کی نسل سے براہِ راست ہے۔ ن۔م۔راشد اور مجید امجد سے اُن کی نہ صرف ملاقاتیں رہیں بلکہ مذکورہ شعرا کے ساتھ اُن کی نشستیں بھی رہیں۔

زیرِ نظر آرٹیکل میں عبدالرشید کی نظموں کے موضوعات اور اُن کے اُسلوبِ شعر اور ٹیکنیکس کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ عبدالرشید انگریزی ادب کے استاد تھے اور اُن کی دلچسپی کے کئی میدان تھے، جن میں آرٹ، کلچر، مغربی ادب، فلم، مغرب میں پوسٹ موڈرن تنقید، فکشن، ڈراما، سنگیت، مغرب میں فلسفیانہ تحریکوں اور وہاں کے ادبی اور سماجی میلانات و رجحانات پر اُن کی نہایت گہری نظر تھی۔ عبدالرشید نے مختلف موضوعات پر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اُن کا غم تمام انسانوں کا بیان ہے مگر اس میں بنیادی جذبہ محبت ہی کا کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی نظموں میں ہجر اور یادوں کا سوز بھی ہے جو ان کی نظموں میں علامتی و استعاراتی سطح پر جلوہ گر

ہوا۔ اُنھوں نے پوسٹ موڈرن مین کے متعدد نفسیاتی اور دیگر مسائل اور نزاکتوں کو اپنی متعدد نظموں کا سرنامہ بنایا ہے۔ اُنھوں نے ایسی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں جو انتہائی منفرد نوعیت کی حامل کیفیات اور احساسات پر مبنی ہیں۔ زیرِ نظر آرٹیکل میں اُن کے اولین شعری مجموعہ "انّی کنت من الظالمین" پر توجہ مرکوز کی گئی ہے اور اُن کی نئی نظم کی متعدد فکری جہات کی آج کی صورتِ حال اور معروض کے پیشِ نظر تعبیرات کی گئی ہیں اور اُن کی انفرادیت، تکنیک اور موضوعات کو کھنگالا گیا ہے یا اُس کی کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عبدالرشید محض جدید موضوعات کے عَلم بردار تخلیق کار نہیں بلکہ مابعد جدید موضوعات کے علم بردار تخلیق کار ہیں تو ذرا بھی مبالغے والی بات نہیں ہو گی۔ وہ اپنی ہمہ پہلو فکر کے ساتھ سب سے الگ تھلگ نئی نظم میں اپنی پہچان کرواتے نظر آتے ہیں۔ عبدالرشید کا پہلا شعری مجموعہ "اِنّی کنت من الظالمین" 1975ء میں شایع ہو کر منظرِ عام پر آیا تھا مگر شاعری کے سنجیدہ قارئین کے سوا عام ادبی سطح پر مذکورہ شعری مجموعے کی اُس طریقے سے پذیرائی نہ ہو سکی، جس کا وہ ادبی دُنیا میں استحقاق رکھتے تھے۔

عبدالرشید نئی لسانی تشکیلات سے متاثر بھی نہیں تھے اور اُنھوں نے افتخار جالب کے گروپ کے شعرا کی تقلید بھی نہیں کی۔ اُن کی نظموں کا اپنا جداگانہ طرز کا رنگ، آہنگ، اُسلوب اور موضوعات ہیں۔ ایسی ہی تخلیقی صفات اُنھیں اپنے معاصرین سے ممتاز و منفرد مقام پر لا کھڑا کرتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے رجحانات، عمیق مطالعہ، میلانِ طبع کے مطابق اردو نظم میں نئے نئے اضافے اور کامیاب تجربے بھی کیے۔ ان تجربوں میں اُن کی نثری نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں جو بعد میں اُن کے مختلف شعری مجموعوں میں آزاد نظموں کے ساتھ شامل ہوئیں تاہم اُنھوں نے اپنی نظم نگاری کی ابتدا آزاد نظموں ہی سے کی جن میں میٹر، بحور، اوزان کی پابندی بہر حال اس صنف کی ابتدائی اور بنیادی ضرورت ہے۔ اردو میں آزاد نظم لکھنے والوں میں عبدالرشید کا نام یک سر ایک نئے شعری نظام کے ساتھ آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ زیرِ نظر آرٹیکل کے توسط سے یہ بھی جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ مغربی شاعری کا انجذاب عبدالرشید کی شاعری میں اِس طور پر نہیں ہوا کہ اُن کی نظموں میں کسی خاص مغربی شاعر کی آواز کی صاف اور واضح گُونج سنائی دے یا کسی خاص مغربی شاعر کے حوالے سے اُن کی تخلیقات پر گہری چھاپ کی بات کی جا سکے۔ انگریزی کی ایک خصوصیت جو عبدالرشید کی نظموں میں دکھائی دیتی ہے، وہ یہ کہ نظم، خیالات کو غنائی رنگ دینے کا نام ہے یعنی شاعر کے ذمے محض خیالات ہی کو تخلیق کرنا نہیں بلکہ اُسے نئے غنائی پیرائے، پیٹرن اور آہنگ بھی تشکیل دینے چاہئیں۔ اسی بِنا پر انھوں نے اپنی نظموں میں کئی طرح کے آہنگ تخلیق کیے ہیں اور یہی خصوصیت عبدالرشید کی نظموں میں نمایاں ہے اور اس میں بھی انھیں اپنے منفرد اُسلوب، ہیئتوں اور متخیلہ پر مکمل دست رس حاصل ہے۔ اُنھوں نے مغربی معاشرت سے متعلق براہِ راست موضوعات پر بھی متعدد نظمیں تخلیق کی ہیں، اُن سے پہلے متعدد ایسے موضوعات، کیفیات اور احساسات ہیں، جن پر اردو میں شاید ہی کسی نے کوئی نظم لکھی ہو۔ مثلاً ممتاز مصور فرید اکاھلو پر اُن کی ایک بہت ہی منفرد نظم ہے جو اپنی فکر اور ڈکشن کے لحاظ سے اور شعری تجربے اور ادبی اظہار کے لحاظ سے مکمل طور پر اردو دنیا کے لیے نئی نظم ہے۔

CC BY

اردو ادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے ہی اُردو ادب کے مزاج میں سیاسی متعدد حوالوں سے اقتصادی ناہمواری کے مخصوص سیاق میں اور سماجی شعور و ادراک ہویدا ہونے لگا تھا یا بیدار ہونے والا تھا۔ اس اعتبار سے ہمیں حالیؔ، آزادؔ اور اقبالؔ کی شاعری میں مذکورہ تحریکات کا سراغ بھی ملتا ہے اور معاشرتی شعور بھی جھلکتا ہے جو ہندوستان میں بتدریج زرعی معاشرے کی بساط لپٹنے کے بعد اور صنعتیں لگائے جانے کے نتیجے میں کئی ایک تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئے موضوعاتِ سخن کے جنم کا وسیلہ یا ذریعہ بھی بن رہا تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرتی اور سیاسی استحصال کے خلاف ایک مربوط اور مضبوط و مستحکم فکری رَو اور صورتِ حال کی جڑیں کتنی قدیم اور کس قدر پرانی ہیں۔ یہی وہ فکری رَو یا بہاؤ ہے جو بعد میں اقبال، جوش، فراق اور احسان دانش کے شعروں سے پھوٹنے والی توانا روایت کا سبب بنا اور ان کے بعد آنے والوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ہونے کے ساتھ ساتھ نئی شاعری کے راستے ہموار کرنے کی ایک تحریک بھی ثابت ہوا۔ افراتفری اور اخلاقی انحطاط کے پر آشوب دور میں وقت کے ساتھ ساتھ اظہار کے رویوں نے نئے وسیلوں کی تلاش کا سفر شروع کیا تو اور بہت سی اصناف کی طرح جدید نظم کے برگ و بار پھوٹے۔ نئی نظم کے پیش رو شعرا میں ن۔ م راشد اور میراجی کو اگرچہ بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن نئی نظم میں اختر الایمان بھی اپنے منفرد اسلوب اور مختلف فکر اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اِس ضمن میں فضیل جعفری لکھتے ہیں:

"نئی نسل راشد یا میراجی یا اختر الایمان کے پائے کا کوئی شاعر پیدا نہیں کر سکی لیکن یہی کیا کم ہے کہ شاعروں کی یہ کھیپ اجتماعی طور پر اردو شاعری میں ایک ایسی جدید اور مضبوط روایت کی بنیاد رکھنے میں بہر حال کامیاب ہو گئی جو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے اور مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے مستقبل کے ادبی سورج اور نقاد چاہیں بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"(۱)

ان شعرا نے نئی نظم کے چمنستان کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی اور بعد میں فیض احمد فیض اور مجید امجد نے اپنے تخلیقی برگ و بار سے اس کی فضا کو معطر کیا۔ یہ وہ فضا تھی جس میں نئے اسلوب، نئے استعاروں اور نئی تمثالوں نے محبت، انسانیت، فطرت، حق پرستی اور حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی شعور کی نمائندگی کی۔ ان نئے لکھنے والوں نے مختلف وقتوں میں جبر اور استبدادی طاقتوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی اور لفظوں کی حرمت کو قائم رکھتے ہوئے معاشرے کو عملی وجدوجہد کی جانب ابھارا۔

اس عہد کے شعرا میں احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، فارغ بخاری، منیر نیازی، حبیب جالب، شہرت بخاری، احمد فراز، افتخار عارف، اختر حسین جعفری، سرمد صہبائی جیسے شعرا اور فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر جیسی شاعرات نمایاں ہیں۔ یہ وہ جدید نظم نگار ہیں جنھوں نے اس صنفِ سخن میں نئی سمتوں کی نشان دہی کی اور ان کا فکری رویہ ایک منفرد پہچان بن کر سامنے آیا۔

قبل ازیں ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک نے جہاں نئے فکری تحرکات سے ادب کی تخلیقی بنیادوں کو مستحکم کیا وہیں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تحریکوں کی پیش کش ایک عرصے تک کلاسیکی شعری روایت کے ساتھ بھی اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے تھی۔ نظم ہو یا غزل، افسانہ ہو یا ناول، زبان و بیان کے طے شدہ اصولوں اور اصناف ادب کی حرمت کو قائم رکھنے میں پیش پیش تھی۔ ترقی پسندوں میں علی سردار جعفری ہوں یا ساحر لدھیانوی، مجاز لکھنوی ہوں یا اس تحریک سے وابستہ دوسرے

CC BY

شعرا، سب کے ہاں ہمیں فکری لحاظ سے نئے خیالات، نیا آہنگ اور نیا شعری منظر نامہ نظر آتا ہے مگر زبان و بیان کے طے شدہ قاعدوں کے خلاف بغاوت نظر نہیں آتی اور نہ ہی انھوں نے تشکیلِ فن کے عمل میں نئے تجربات کیے۔ یہی رویہ ہمیں حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ اہلِ سخن کے ہاں ملتا ہے بلکہ حلقے سے وابستہ ادیبوں اور شعرا نے زبان و بیان کے طے شدہ اصولوں پر زیادہ توجہ دی۔ تاہم مروجہ اسالیب بیان سے بغاوت کا عنصر بھی ایک فطری عمل تھا، بعد کے نئے لکھنے والوں نے ایک عرصے کی روایت کو توڑنے اور تخلیقی عمل کو منفرد بنانے کے لیے نئے راستے بنانے کی جانب پیش قدمی کی۔ حلقے سے وابستہ شاعر یوسف ظفر نے بہت پہلے کہا تھا:

کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں(۲)

یوسف ظفر کے نزدیک خیالات کی یہ رفتار وہ نہیں تھی جو بعد کے نظم گو شعرا کے ہاں ہمیں ملتی ہے۔ تقریباً دس پندرہ سال بعد ہر دور ایک نئی نسل کے جوان ہونے پر تیزی سے خیالات اور اقدار کی تبدیلی کے ساتھ ابھرتا ہے، یوں ادب میں بھی نئی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور ہر تبدیلی پچھلی تبدیلی کو رد کرتی چلی جاتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ تبدیلیاں شروع کے چند برسوں میں اگرچہ بہت سست رفتار تھیں مگر ۱۹۶۰ء کی نئی نظم کی تحریک نے ادب میں جو ہلچل پیدا کی اور ہر پرانی روش کو ترک کرنے کا نہ صرف عندیہ دیا بلکہ اس تحریک کے نمایاں شاعر افتخار جالب نے نئی نظم کا ایک منشور بھی دے دیا، مگر یہی وہ دور ہے جب نئی نظم کے ہر اول شعرا میں مجید امجد نمایاں سطح پر اپنے منفرد اسلوب اور بلندیِ فکر کے ساتھ نئی نظم کو مستحکم بنیادوں پر لے کر کھڑے تھے یوں ۱۹۶۰ء کی نئی نظم کی تحریک اور اس کے وابستگان کی شعری کاوشیں زیادہ اہمیت اختیار نہ کر سکیں تاہم ایک نیا تحرک ضرور پیدا کر دیا۔(۳)

البتہ اس تحرک کے حوالے سے اگر ہم بارتھ (Barthes) کے اس نقطۂ نظر کو، کہ: "New is not a fashion, it is a value upon which is founded in all criticism" تو اردو میں نئی نظم کی تخلیق بھی کسی فیشن کے ضمن میں نہیں آتی بلکہ مجموعی اعتبار سے پوری ایک نئی ادبی قدر کے طور پر نمایاں ہوئی۔ نئی نظم کے آہنگ اور اسلوبِ بیان میں ما قبل تخلیقی رجحانات سے الگ ایک ایسا میلان نمو پذیر ہوتا نظر آیا جس نے نظم کی تخلیق کو جدیدیت کی اُس لہر سے بھی مختلف کر دیا جو ساٹھ کی دہائی سے پروان چڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔ اب شاعری اپنی پہچان نئے زاویوں سے کرانے پر آمادہ تھی۔ کچھ عام رکھ رکھاؤ سے یک سر الگ اور تہ دار نفسیاتی عوامل کی گتھیاں سلجھانے کے بجائے اپنے نئے اظہاریے کے ساتھ پردۂ قرطاس پر لانے کو عمل پیرا تھی۔ کسی توجیہہ اور حل طلب سوالات کے بجائے محض سوالات اور قاری کو اس امر پر مجبور کرتی ہوئی کہ وہ اس سے جو چاہے اخذِ مطلب کر سکتا ہے۔ اس عہد میں بھی یقینی طور پر ساٹھ کی دہائی کا اثر تھا مگر اس سے اسلوبِ بیان کو ایک اور نئے زاویے سے دیکھنے کا رویہ کار فرما

CC BY

نظر آتا ہے۔ قبل ازیں ن۔م۔ راشد کے چوتھے شعری مجموعے میں جو پیچیدگی اور گہرا پن ملتا ہے وہ ان کے ابتدائی مجموعوں میں عدیم الوجود حد تک خال خال نظر آئے گا، لیکن چوتھے شعری مجموعہ "گماں کا ممکن" نے نظم کے بیانیے کو پیچیدہ اور تہ دار بنا دیا۔ یہ رویہ ہمیں کسی حد تک میراجی کے ہاں بھی نظر آتا ہے مگر راشد نے اس کو اپنے اسلوبِ بیان اور نئے زاویے سے آگے بڑھایا اور قاری کو محض بیانیے سے آشنا نہیں کروایا بلکہ سوچ پر ابھارنے اور نتائج اخذ کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ سوچ ایک نظامِ خیال کے ساتھ نئی نظم کی تحریک میں ابتدا میں ضرور کارفرما نظر آتی ہے جس نے شعرا اور ادبا کو نئی تخلیقی سرگرمیوں کی جانب ابھارا، مگر آہستہ آہستہ اپنے مخصوص نظریے اور نظامِ خیال کے حقیقی تصور سے دُور ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

"ادب اور ہر تخلیقی سرگرمی کا تعلق براہِ راست نظامِ خیال سے ہوتا ہے۔ ہر نظامِ خیال اندرونی طور پر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جس کی اپنی مخصوص روح، مخصوص شخصیت اور مزاج ہوتا ہے۔ یہ روح اپنا اظہار اپنے علوم و فنون، اپنے فلسفے، اپنے اداروں اور اپنی متنوع تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعہ کرتی ہے۔ ہر تخلیقی سرگرمی ایک زندہ نظامِ خیال کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور نظامِ خیال کے انجماد کے ساتھ اپنے سارے تہذیبی اداروں اور اظہار کے سانچوں کے ساتھ خود منجمد ہو جاتی ہے۔(۴)

۱۹۶۰ء کی نئی نظم کی تحریک جب اپنے مخصوص نظامِ خیال سے دور ہوتی گئی تو محض لسانی تشکیل کے عمل سے زندہ نہیں رہ سکتی تھی، اس لیے آہستہ آہستہ اظہار کے نئے سانچوں کے باوجود ساتھ ہی ساتھ منجمد ہوتی چلی گئی۔ تاہم عبدالرشید اور ان کے بعض ہم خیال شعرا کی نظم نگاری ہمیں اس سے کہیں آگے لے جا کر معنی کی تہ در تہ پرتوں سے آشنا کرواتی ہے، البتہ عبدالرشید کی شاعری میں ۱۹۶۰ء کی تحریک کے اثرات ان کے اپنے مخصوص نظامِ خیال کے ساتھ نظر آتے ہیں جس کو ان کے بیانیے کی پیچیدگی اور علامت نگاری کی مخصوص روش مزید مشکل اور پیچیدہ بنا دیتی ہے، یوں ان کے قاری کا پہلے کی نسبت بالغ نظر ہونا زیادہ ضروری ہے۔

عبدالرشید کی آزاد نظمیں:

عبدالرشید محض جدید نہیں بلکہ جدید تر نظم نگار ہیں اور اپنے ہمہ پہلو فکر کے ساتھ سب سے الگ تھلگ نئی نظم میں اپنی پہچان کرواتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ وہ مجید امجد کے ساتھ بھی خاصا وقت گزار چکے تھے اور مجید امجد کے دوسرے مجموعہ "شبِ رفتہ کے بعد" کے مرتب کی حیثیت سے بھی ان کی ادبی اہمیت مسلمہ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا مگر اس سے پہلے عبدالرشید کی آزاد نظموں کا مجموعہ "انی کنت من الظالمین" ۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکا تھا مگر شاعری کے چند سنجیدہ قارئین کے سوا عام ادبی سطح پر اس کی پذیرائی نہ ہو سکی۔

عبدالرشید نئی شاعری اور لسانی تشکیلات سے متاثر ضرور تھے لیکن تقلید کے بجائے ان کی نظموں کا اپنا رنگ ہے جو سب سے جدا اور منفرد ہے۔ یہی انفرادیت عبدالرشید کو اپنے معاصرین میں نمایاں کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے رجحان اور میلانِ طبع کے مطابق نظم میں نئے نئے اضافے اور تجربے بھی کیے۔ ان تجربوں میں ان کی نثری نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں جو بعد میں اُن کے مختلف شعری مجموعوں میں آزاد نظموں کے ساتھ شامل ہوئیں، تاہم ابتدا انھوں نے آزاد نظموں سے کی جن میں بحور و اوزان کی پابندی

CC BY

بہر حال اس صنف کی ابتدائی ضرورت ہے۔ مجید امجد کے ساتھ وقت گزارنے کے باعث یہ ممکن نہ تھا کہ اُن کی شاعری نثری نظم کا رُخ اختیار کرتی، تاہم اپنے فکری تنوع کے تحت انھوں نے بعد میں زیادہ تر نثری نظمیں لکھیں، البتہ "انی کنت من الظالمین" کی نظمیں ان کے خاص فکری آہنگ اور مجید امجد کے اثرات ہونے کے باوجود ان کی اپنی مخصوص تخلیقی روش کا اہم امتیاز ہیں۔

آزاد نظم نے نئے شعری عمل سے اپنا وجود تسلیم کروایا تھا۔ نئے شعری عمل کے تحت اس کے خدوخال اجاگر ہوئے۔ روایت سے رشتہ رکھتے ہوئے بھی آزاد نظم نے ان قدغنوں کو توڑا تھا جو شعری عمل میں خیالات کو محض قافیہ پیمائی تک محدود رکھتے تھے۔ آزادانہ اظہار کے لیے ایک ایسے سانچے کی ضرورت تھی جس سے خیال اور شاعری کا مطمحِ نظر کھل کر واضح ہو سکے اور ایک مربوط فکری تسلسل کے ساتھ قاری پر اپنے اظہار کا عندیہ پیش کر سکے۔ البتہ آزاد نظم لکھنے والوں میں عبدالرشید کا نام یک سر ایک نئے شعری نظام کے ساتھ آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

عبدالرشید کی آزاد نظموں کا تنقیدی جائزہ:

"انی کنت من الظالمین" عبدالرشید کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کی ۳۶ عدد چھوٹی بڑی نظموں میں اُن کی تخلیقی ہنرکاری آزاد نظم کی صنف کو اعتبار بخشتی ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم حمدیہ ہے۔ حمد نظمیہ صنف کے اعتبار سے خدا کی وحدانیت کا اقرار اور اس کے جلال و جمال کا بیان ہے۔ کسی بھی زبان کی شاعری ہو، جب حمد کا بیان مقصود ہو تو صفاتِ الٰہیہ ہی کو رقم کیا جاتا ہے، جب کہ عبدالرشید کی اس نظم میں خدائی صفات کا بیان ان کے لاشعور کی تہوں سے زیبِ قرطاس ہوتا ہے۔ خدا کی قوت و جبروت تو اُن کے نزدیک بھی مسلمہ ہے، لیکن وہ براہِ راست یا شعوری طور پر اپنے نئے تخلیقی عمل سے اسے چیزے دگر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً یہ مصرعے دیکھیے:

ماسوائے موت کے اتنا سخی پھر کون ہے جو جسم کے تاریک زنداں میں
پیہم ولولوں کی مشعلیں روشن کیے خود کو جلائے
پُل کے تختوں سے سرکتی ریت کے ذرّوں سے سورج
نہر کے سیّال سینے پر بچھی بے دم تمازت اور
رگ و پے کی لڑھکتی نبض میں مفتوح جذبوں کا بخار (۵)

ایک احساسِ گراں کے تحت خدا کی قوت و جبروت کے آگے انسان کی بے بسی اس حمدیہ نظم میں شاعر کے احساس کو جس کیفیت سے دوچار رکھتی ہے، وہ بھی صفاتِ الٰہیہ کا علامتی اظہار ہے۔ "پُل کے تختوں سے سرکتی ریت کے ذرّوں میں سورج" وقت کی علامت ہے جو گزرتا چلا جا رہا ہے اور "نہر کے سیّال سینے پر بچھی بے دم تمازت" بظاہر سورج کی حرارت کا احساس دلاتی ہے مگر یہ حرارت چوں کہ نہر کے سیّال سینے سے مربوط ہے اس لیے ایک سرد آگیں احساس کی علامت بن گئی ہے۔ یہ نظم میں ایک نئی محاکاتی صورتِ احوال بھی ہے مگر محاکات کے ان رنگوں میں جبریت کا احساس بھی پوشیدہ ہے۔ سب کچھ ایک فطری عمل کے تحت

CC BY

ہو رہا ہے مگر "رگ وپے کی لڑھکتی نبض میں مفتوح جذبوں کا بخار" یا "ہر قدم پر یوں تلف ہونے کا احساسِ گراں" ایک ایسا بیانیہ ہے جس سے نقش گرِ قدرت کی فیض رسانی کا پہلو مادی اشیا کے لیے بھی ہے اور انسانی رگ وپے میں خدائی قدرت کے آگے جذبات کے مفتوح ہونے کا احساس بڑھاتا ہے۔ انسان کو آخر فنا کے گھاٹ اُترنا ہے، شاعر کو اس کا شدت سے احساس ہے۔ پانچ ہزار سال پرانی گلگامش کی منظوم داستان میں نظم کا مرکزی کردار دیوتاؤں کے فرستادہ (ایابنی) کے ذریعے جب تمام دنیوی نعمتوں سے وہ سرشار ہو جاتا ہے اور اسے اس فرستادہ سے والہانہ محبت ہو جاتی ہے تو ایک روز اُس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تب گلگامش کو بے اختیار سخت صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کے غم میں بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جب اس کا سب سے پیارا رشتہ موت کا شکار ہو گیا تو کیا اسے بھی ایک روز موت آ جائے گی۔ تب وہ گلِ حیات کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے مگر طویل تر مشقتوں کے ساتھ جنگلوں، صحراؤں، دریاؤں اور مختلف خطرناک وادیوں سے گزرتا ہوا جب گلِ حیات لے کر واپس آتا ہے تو راستے میں ایک جگہ نیند کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر نیند کی وادی میں چلا جاتا ہے اور وہ گلِ حیات جسے وہ اپنے سینے پر رکھ کر سو گیا تھا ایک سانپ آ کر نگل جاتا ہے۔ گویا تمام تر کوششوں کے باوجود موت اس کا مقدر ہے۔ یہاں داستان نگار نے اس قدرتی جبر کو، جو انسان پر موت کی صورت میں موجود ہے، دکھایا ہے اور اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ بالآخر انسان کو فنا ہونا ہے۔ عبدالرشید کی اس نظم میں بھی ایک اساطیری لہجے کا بیانیہ دکھائی دیتا ہے جو اس حقیقت کو واضح کرتا ہے:

بے وطن خوشیوں کی پُونا مطمئن چہرے کی یخ بستہ لکیروں میں جمی
سمت سے بے سمت نتھوں سے بندھی رسّی کو کھینچے
جسم کے پنجرے سے لٹکا آخری بھی چیتھڑا، جب بے صدا
آبِ فنا کی دھار پر بہتے ہوئے خوابوں کے مرگھٹ میں گیا(۶)

"سمت سے بے سمت نتھوں سے بندھی رّسی" ایک ایسا المیّہ ہے جو انسان کا مقدر ہے۔ وقت کا دھارا اسے کھینچ کر موت کی جانب لے جا رہا ہے، مگر:

کس لیے ٹھٹھرے ہوئے ہونٹوں کی یخ سیٹی کی سُر میں تر بہ تر
یہ سانس کی تعزیر سے بچنے کی مہلت کی دُعا(۷)

جس طرح گلگامش "گلِ حیات" کی تلاش میں نکلا اور اسے حاصل بھی کر لیا، لیکن وہ اسے اپنا مقدر نہ بنا سکا، بالکل اسی طرح "سانس کی تعزیر سے بچنے کی مہلت کی دُعا" بھی شاعر کے لیے ایک لایعنی عمل ہے۔ عبدالرشید کے نزدیک موت جب ایک ازلی حقیقت ہے، "ہونٹوں کی یخ سیٹی کی سُر" یعنی جب آخری سانس کو ایک ہچکی کے ساتھ ختم ہو جانا ہے تو پھر اس کو بچانے کے لیے دُعا کا عمل کس لیے ہے۔ یہاں عبدالرشید نے بڑی فن کارانہ چابک دستی سے موت کے المیّے کو پیش کیا ہے اور اس سچائی کو واضح کر دیا ہے جو وقت اور اس کے مظاہر سے انسانی حقیقت کا مستقل مظہر ہے۔ اس نظم میں علامت نگاری کا عمل عروج پر دکھائی دیتا ہے۔

CC BY

عبد الرشید نے اپنی مخصوص علامات کے ساتھ اپنے مقصودِ اظہار میں محض جدت نہیں بلکہ ایک نئی ندرت پیدا کی ہے۔ اسلوب کی سطح بظاہر گنجلک دکھائی دیتی ہے اور یہ محض نامانوس یا جدید تر علامات کی وجہ سے ہے، اور یہی نظم کے بیانیے کو بھی جدید تر بناتی ہیں۔ یوں عبد الرشید کی اکثر نظموں کا بیانیہ ہمیں ایسے ہی دشوار گزار مرحلوں سے دوچار کرتا ہے جن میں نظم کو سمجھنے کے لیے قاری کو بہت سی مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

عبد الرشید نے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے ہاں دکھ اور گہرے کرب کا بیان ہے۔ ان کا غم تمام انسانوں کا بیان ہے مگر اس میں بنیادی جذبہ ان کے ہاں بھی محبت ہے۔ اس میں ہجر اور یادوں کا سوز ہے جو ان کے لفظوں سے مختلف علامات کی صورت میں جھلکتا ہے۔ وہ محبت کے جذبے کو تمام نوعِ انسانی کا اہم ترین موضوع تصور کرتے ہیں۔ اس میں ان کی ذاتی واردات بھی اس کائناتی حقیقت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جو ان کی نظموں میں کبھی سوچ کے آکاش پر بادل کی صورت میں پرواز کرتی ہے، کبھی بارش بن کر اور کبھی بوند میں سمٹ کر دل کی دھرتی پر اترتی ہے اور بکھرتی ہے۔ یہ اوس کی صورت پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے۔ ''انی کنت من الظالمین کی ایک نظم ''دوب جیسی انگلیوں سے'' ایک ایسی نظم ہے جس کا آہنگ قرأت میں بھی دل کش ہے اور لفظ لفظ اس کی سماعت کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ''سرخ آنکھوں سے محبت کی وفا کا پہلا گیت'' اور ''اوس میں بھیگے ہوئے بچپن کا نشہ'' جو ''دوب جیسی انگلیوں سے بہہ گیا'' ہمارے سامنے معاملاتِ محبت کے کئی پہلوؤں کو ایک دیکھے ہوئے منظر کی طرح روشن کر دیتا ہے۔ اِس ضمن میں یہ مصرعے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

کھڑکیاں کھولیں تو شب کی تیرگی کا ٹھنڈا سانس
برف کے آنسو کی صورت
آنکھ سے بہنے لگا
میں مگر اس پیار کی نخوت کی دل جُوئی میں تھا(۸)

یہاں شاعر نے یادوں کی کیفیت بیان کی ہے، ایسی صورتِ احوال میں جب محبوب کی جبلت نخوت آمیزی سے عبارت ہے۔ یہاں دو انتہاؤں کا احساس ہے۔ ایک جانب محبت کا جذبہ ہے اور دوسری طرف محبت سے پیدا ہونے والی وہ نخوت ہے جس سے شاعر خود بھی سرشار ہے مگر حقیقت میں ہجر زدہ ماحول رات کے اندھیروں میں ہجر کا کرب پیدا کر کے بے بسی کے آنسوؤں میں ڈھل گیا ہے۔ ایک کرب انگیز سماں ہے جو نیند اور جاگنے کے درمیان دھند کی چادر میں برقی قمقموں، تھکے ہارے قدموں، پچھلی سنگتوں کا بوجھ، گرم رو جذبوں کی مسکان اور:

کانپتے ہاتھوں سے بے ترتیب سانسوں کا بہاؤ
اور خزاں کے آخری پتوں کی باس
ایک ہی موسم میں پھیکی پڑ گئی(۹)

CC BY

اور یہ سب کچھ شاعر کے لیے اندوہ و غم کا باعث تو ہے، لیکن اس سب کے باوجود اس مصرعے کی تکرار سے محبت کا دل گداز احساس لہریں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو محبت کی ازلی حقیقت اور اس کی سچائی کا احساس دلاتا ہے:

میں مگر اس پیار کی نخوت کی دل جُوئی میں تھا(۱۰)

محبت آگ کی طرح سلگتے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں، کیوں کہ محبت کی تپش میں کچھ عجیب اسرار ہوتے ہیں جو کبھی عیاں نہیں ہوتے۔ اس نظم میں محبت کا گہرا احساس عبدالرشید کو حال سے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے پر مائل کرتا ہے۔

دراصل عبدالرشید کی شاعری ایک منفرد قسم کی جاذبیت کی حامل ہے۔ جدید ترحسیات اور عصری آگہی سے پھوٹتے ہوئے ان کی شاعری کے سوتے ان کو ایک نئی لفظالی کے ساتھ نئی ماہیتِ فکر سے متعارف کرواتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے ہاں کے مکالمے کا ایک دل کش انداز ملتا ہے۔ اس مجموعے کی نظم "کالج نامہ" کا انداز مکالمے اور خود کلامی کا سا ہے اور یہ عبدالرشید کے تخلیقی اندازِ نظر کا ایک اہم رُخ بھی ہے۔ عبدالرشید کے ساتھ کالج کی یادیں اتنی گہرائی اور شدت سے جڑی ہیں کہ وہ اپنے دوسرے مجموعے "اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں" میں بھی کالج کی یادوں سے پہلو تہی نہیں کر سکے بلکہ دوسرے مجموعے میں اس عنوان کے تحت ان کی چار عدد نظمیں ہیں جن میں ایک تو یہی ایک پہلی نظم ہے جو دوسرے مجموعے کی تین نظموں سے پہلے انھوں نے شامل کی۔ "انی کنت من الظالمین" میں شامل اس نظم "کالج نامہ" میں وہ گزرے لمحوں کی بازیافت کرتے ہوئے ان کے تمام احساس کو اپنے اندر ونی انجذاب سے دریافت کرتے نظر آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو شاعری خود کلامی ہی کا ایک اظہار ہے مگر یہ خود کلامی عام انسانوں کی نسبت شاعر کے مخصوص سُروں سے پھوٹتی ہے۔ کبھی وہ ارد گرد کے مناظر کو ترتیب دیتا ہے اور کبھی خود پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے اندر کے احساس کو بیدار کرتا ہے۔

عبدالرشید نے اس نظم میں اپنے اندر کے احساس کو بیدار کرتے ہوئے "درختوں کے تنوں کے ساتھ" گزرنے والے لمحات اور "ماضی کے سنہرے دائروں" کی جزیات سمیٹ لی ہیں۔ "سگریٹ کے مرغولوں" اور "چائے کی پیالی" تک کالج کی دل کش زندگی اور کالج سے متعلقہ کیفیتوں کو اجاگر کیا ہے۔ مثلاً یہ لائنیں دیکھیے:

درختوں کے تنوں کے کے ساتھ، / ہم سب کرسیاں رکھ کر، بلند آواز میں
ڈلن تھامس کو پڑھتے تھے(۱۱)

اور:

تہ ملبے میں اک بلبل کی راکھ، / گریزاں ساعتوں سے چھن کے گرتی تھی
ہوا کے چاک میں اک در، / کبھی وہ بند ہوتا تھا، کبھی کھلتا
دھوئیں کے ساتھ کتنے عکس تھے / جو ایک لمحے کے لیے بنتے بگڑتے تھے
ہرے پتوں کی خوشبو، مضطرب بانہوں میں پھیلی تھی

CC BY

جوانی کی یا موسم کی اداسی تھی(۱۲)

یہ سب شاعرانہ امیجز شاعر کی جوانی اور اس سے جڑے ہوئے مناظر میں کبھی خوشی اور کبھی یاد کا کرب لے کر اس کے معجز نما اسلوب سے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں:

شبیہیں ریزہ ریزہ، اُس بڑی تصویر کے قامت کا حصہ ہیں
کہ جن کے ہاتھ میں / ایک پرزے کی طرح،
ہوا کی تند آندھی میں پٹختا ہوں / مگر یہ سب اُسی سب تک کا حصہ ہیں
وہ شامیں بھی کہ جب کافی کا اک کپ پی کے
ہم پھر مال کی ٹھنڈی ہوا میں سُن جبیں پر ہاتھ کو رکھتے
درختوں سے ڈکتے آخری پتے اُچھل کر توڑتے(۱۳)

عبدالرشید نے اس نظم میں صرف اپنے ماضی ہی کو یاد نہیں کیا بلکہ انھیں اپنی زندگی کا اہم تر حصہ قرار دیا ہے کہ یہ احساس ان کی زندگی کے سفر میں ساتھ ساتھ چل رہا ہے:

یہ اک چھوٹی سی دنیا ہے جو کہرے میں چھپی ہے
کہ جو بیتی نہیں اور جس طرف ہم / اک قدم آگے نہ بڑھ پائے کبھی(۱۴)

"انی کنت من الظالمین" میں چار ایسی نظمیں بھی ہیں جو ایک ہی نظم کے مختلف ٹکڑوں کی طرح بظاہر چار حصوں میں تقسیم ہیں، لیکن دراصل یہ مختلف نظمیں ہیں۔ فکری اعتبار سے ان نظموں کا ربط اگرچہ باہمی ہے، لیکن مختلف بحروں میں کہی گئی ہیں۔ یہ بلاعنوان نظمیں ہیں یعنی ایک سے چار تک۔ ان نظموں کا ایک اہم تر پہلو اُن نظموں کا طویل ہونا ہے۔ طویل نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مافی الضمیر کو بیان کرنے کا زیادہ سے زیادہ امکان موجود رہتا ہے اور زمانی و مکانی سچائیوں کے اظہار کا کھل کر موقع ملتا ہے۔ متذکرہ چار نظموں کا سلسلہ بھی ان کی طویل نظم نگاری کا پہلو رکھتا ہے جن میں کرب انگیز تجربات و مشاہدات کے تحت مختلف کیفیتوں کا اظہار ہے۔ مثلاً پہلی نظم کی یہ لائنیں دیکھیے:

شبِ تار جیون کی کھڑکی پہ دستک سی دیتی ہوئی، آنسوؤں کی
ڈھلکتی ہوئی چال میں چل رہی ہے
برہنہ ہواؤں میں نہروں کے نم کا لڑکپن گلِ تازہ بن کر بکھرتا چلا جا رہا ہے
یہی شب جو بارش کے قطروں سے اٹھتی ہوئی باس کی نیم خوابیدہ جنبش میں
تیرے بدن پر مرے ہاتھ سے گیت لکھتی رہی تھی(۱۵)

CC BY

بغیر کسی ابہام کے، یہ نظم اسی تسلسل میں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس کا ایک ایک پہلو قاری پر اپنے اثرات مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ اس نظم کی علامتیں ایسی کھلی علامتیں ہیں جو فکر کو انگیز بھی کرتی ہیں اور ابہام کے بجائے تاثر کو بڑھاتی ہیں:

"کوئی ڈھارس نہیں، اپنی خود رفتگی سے حرارت بڑھی
دن ڈھکیلا گیا سیڑھیوں سے رواں برف پر
رات پکنے سے پہلے ہنسی، بند کمرے سے ملحق جو شاور تھا
بہنے لگا، آنسوؤں کے پرندے پنہ سے نکل کر اُڑے(۱۶)

ہنسی بند کمرے سے ملحق شاور اور آنسوؤں کے پرندوں کا اڑنا ایک تلازماتی کیفیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ عبدالرشید کی نظموں کی یہ خصوصیات ان کی بیش تر نظموں میں موجود ہے۔ ایک زوایے کو دوسرے زاویے سے مربوط رکھنا نظم کی اپنی خصوصیت تو ہے مگر معنوی اعتبار سے حرف وصوت سے معنوی خدوخال کو مرتب کرنا عبدالرشید کے ہاں درجہ کمال پر ہے:

جن کی نم نشیں شاخ جو بارشوں میں تناور ہوئی
اس کے اوجھل کوئی آدھے کپڑوں میں ملبوس مجھ کو
تکے جارہا تھا، وہ آنکھیں جو زخمی بھی تھیں اور چہرہ
شکستہ لکیروں کے آثار کی ابتدا بھی لیے تھا
محافظ نہیں تھا، فقط سرگراں اپنی کمزور خواہش سے
رنجور تھا، تم سے الفت یا صحبت مقدر نہیں تھی(۱۷)

اس نظم کا اصل چہرہ اس المیے سے بے نقاب ہوتا ہے جو شاعر کے درونِ باطن کہیں پل رہا ہے:

اس طرح چار برسوں پہ پھیلا
میں اندر سے خاموش تھا، بانجھ پن کی طرف
رفتہ رفتہ لڑھکنے لگا تھا، دلاسا جو مرہم تھا
وہ بھی علالت کی تمہید تھا
ہر کٹائی کے موسم کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا تھا
میں اُمید رکھ کر نیا بیج ڈالوں گا، پر ایسا ہو نہ سکا
آرزو جو اندھیرے کی بُکّل کی تہ میں تھی، لپٹی رہی(۱۸)

دوسری نظم کا المیّہ بھی اسی سلسلۂ یاد کی ایک کڑی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں محبوبہ کی رخصتی کے منظر سے کچھ اور تصویروں کے رنگوں سے اجاگر ہونے والے رنگوں اور ان رنگوں کی کیفیتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انجمن کی چمنی سے نکلتا دھواں بارش کے قطروں

CC BY

سے، جو دراصل شاعر کے آنسوؤں کی علامت ہیں، شاعر کو دھلتا محسوس ہوتا ہے جس سے آس پاس کی ساری فضا میں ایک دھند کا منظر سمٹ آتا ہے، اور گاڑی کے شیشے میں نظر آتا محبوب کا عکس بھی ادھ چھپے کاغذ کی طرح خنکی سے بھیگا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کھنکی شاعر کے اندرونِ دل کی خنکی ہے جو اسے اس کیفیت سے گزارتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے:

بانہوں میں تھامے ریشمی رومال میں طاقت نہیں
کھل کر تری رخصت کا وہ پرچم بنے
کیسے بھلا بانہوں کے حلقوں سے تجھے رخصت کروں
کیسے بھلا(۱۹)

مگر ایک یاد ہے جو اس منظر سے پھوٹنے لگتی ہے۔ گزشتہ موسموں کی یاد جو شاعر کو کبھی نہر کی پٹری یاد دلاتی ہے اور کبھی پھلوں کے بُور سے بھاری درخت، اور یوں ایک ایک منظر ہویدا ہوتا چلا جاتا ہے:

"اک دوسرے کو تھام کر
ہم چاپ کی زنجیر میں جکڑے ہوئے چلتے رہے
نقشِ قدم جگنو بنے سنسان رستوں پر دمکتے تھے
کہ جیسے بے خیالی میں لیے وہ سرسری بوسے
کسی نگراں کے خدشے کے بغیر(۲۰)

اور اب:

ہاتھ ہاتھوں سے پھسل کر فاصلوں کی آستیں پر
ٹوٹتی ٹہنی بنے بیتاب ہیں
سینے کے ملبے پر یہ آندھی ریت کے پہیوں سے چلتی
جانے کتنے روز متلاطم رہے(۲۱)

یہ پوری نظم محبت کے احساس سے جڑی ہوئی نظم ہے مگر اس میں شاعر کا پیرایۂ اظہار عامیانہ محبت سا نہیں بلکہ ایک گہری کیفیت سے ترتیب پایا ہے۔ نظم کا ایک دوسرا پہلو انسانی جبلتوں سے جڑا ہوا ہے اور بین السطور ایک طبقاتی تضاد کے ساتھ فرد کی انفرادی زندگی کے سماجی اور نفسیاتی مسائل کو بھی پیش کرتا ہے جس سے کم و بیش پورا معاشرہ دوچار ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"اگر معاشرے کے پاس اقدار و خیال کا صحت مند نظام باقی نہیں رہا ہے اور معاشرہ خود کو بدلنے کے کرب میں مبتلا ہے تو اس معاشرہ کی ہر تخلیقی سرگرمی اور ادب بھی مردہ اور بے جان ہوگا۔ ادب خلا میں تہذیبی تعطل میں منجمد نظامِ خیال کے بوسیدہ دائرہ

CC BY

میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ تہذیبی قوت کے شدید ضعف کے باعث آج ہمارا ادب معاشرے کے لیے ایک روحانی تجربہ نہیں رہا ہے۔"(۲۲)

ادب کی روحانی تجربے کے بغیر تخلیق، ظاہر ہے انتہائی پست ہو گی اور معاشرے سے اس کا ربط محض خیالی ہو گا، لیکن خوش گوار امر یہ ہے کہ عبدالرشید کی تمام شاعری اگر روحانی تجربہ نہیں بھی بنتی تو اس کا تعلق ایک دردمندی کے ساتھ ضرور جڑا ہوا ہے۔ وہ معاشرے کے ظاہری و باطنی آشوب کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس معاشرے میں انھیں فرد کی سماجی زندگی ایک ایسے المیے سے دوچار نظر آتی ہے جو ایک حسّاس دل رکھنے والے شاعر کے لیے ایک تحیر زا المیہ بھی ہے، یوں نظم کے بین السطور سے کرب انگیز لمحات کی ایک تحیر آمیز کیفیت بھی ساتھ چلتی ہے۔ ایسا تحیر جس سے شاعر اگرچہ حقیقی معنوں میں پہلے سے آشنا ہے مگر نظم کے مجموعی خدوخال شاعر کے انجامِ ہجر کو بھی ایک متحیرانہ انجام سے دوچار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد نے آزاد نظم کے پیش رَو تصدق حسین خالد کے بارے میں لکھا تھا:

"ان کے یہاں نظم کی بُنت (Composition) یعنی تحیر و تشکیل کی ترتیب و ترکیب نے جو لہجہ اور انداز پیدا کیا، وہ نظم کے قاری کے لیے بالکل نیا ہے۔"(۲۳)

یہی کیفیت ہمیں عبدالرشید کی اکثر نظموں میں ملتی ہے۔ یہ روایتی ہیئتوں کی تبدیلیوں کا مرحلہ تھا، لیکن جب آزاد نظم کے ذریعے ان تبدیلیوں کو گوارا کر لیا گیا تو نظمِ آزاد ہی نئی نظم کا سرنامہ ٹھہری۔ دوسرے جدید شعرا کی طرح عبدالرشید کے ہاں بھی نظم آزاد کا فنی پہلو ابتدا میں زیادہ جاذبِ نظر اور اپنے مطلوبہ لوازم کے ساتھ نظم کی جملہ خصوصیات رکھتا ہے اور وہ تحیر و تشکیل جس کی جانب ڈاکٹر رشید امجد نے اشارہ کیا، عبدالرشید کی نظموں میں فنی شعور کے ساتھ موجود ہے۔

"انی کنت من الظالمین" کی تیسری اور چوتھی نظم بھی محبت آمیز جذبات اور احساسات کی ترجمان ہے۔ ان نظموں میں بھی عبدالرشید اپنے منفرد شعری پیرایے کے ساتھ یادوں کے رنگا رنگ مناظر کو خوب صورت Images کے ساتھ اپنی نقش گری کے ہنر سے اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ تیسری نظم کا سلسلہ کلام دوسری نظم میں بیان کیے گئے محبوب کی رخصتی کے بعد کا ہے۔ وہاں رخصتی کی کیفیت تھی اور یہاں رخصتی کے بعد ایک بے چینی کی کیفیت ہے۔ اس کیفیت میں یادیں ہیں، محبوب سے ہم کلامی اور وصل کی لذتیں ہیں، کہیں کہیں:

تھیٹر کے یخ بستہ اندھیرے میں / لرزتے کانپتے ہاتھوں سے تم کو
اپنی جانب کھینچنا / چپکے سے موقع دیکھ کر پھر شال میں
محرم کی ڈوری دھیرے دھیرے کھولنا / کتنی باتیں ہیں
مگر اک لفظ بھی گرمی کی حدت سے لکھا جاتا نہیں(۲۴)

CC BY

ایسی نظموں کو ہمارے بعض نقاد جنسی تلذذ سے تعبیر کرتے ہیں یا کرنا چاہیں گے، مگر نظم کے پورے بیانیے سے شاعر کا دلی کرب اتنی شدت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ بعض ایسے پہلوؤں کو بھی بے تکلفی اور اپنی فطری سچائی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے جو عرفِ عام میں جنسیت زدہ محبت کا شاخسانہ لگتی ہیں مگر حقیقتاً ایسا نہیں، شاعر کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ اُس کا رہوارِ قلم کن حقیقتوں کو چھو رہا ہے، وہ اپنی طبعی اور تخلیقی صداقت سے محبوبیت کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنے میں بے اختیار ہے اور یہی بے اختیاری ایک حقیقت نگار شاعر کی باطنی سچائی کو بھی سامنے لاتی ہے۔ اس سلسلے کی آخری نظم (چوتھی نظم) کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر محبوب کی جدائی سے ایک لطف انگیز کیفیت بھی کشید کر رہا ہے اور یادوں کے ریلے میں اس حقیقت کو بھی تسلیم کیے ہوئے ہے کہ اُسے آخر بچھڑنا تھا:

کب بچھڑنا ہے، مجھے معلوم تھا، تاریخ بھی دن بھی۔۔۔۔

اب آستینوں کی طرح الٹے ہوئے، ننگے بدن کی پشت سے اب پشت ملتے آئنوں میں دیکھتے ہیں یہ سراپا اور اس پر اختیار۔۔۔۔

(۲۵)

اور پھر: "اپنی آنکھوں سے یہ آنسو پوچھ دو" کے اعلامیے سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے، جس سے شاعر اپنی خود کلامی کے جہان میں ایامِ رفتہ کی رفاقت ہی کو اپنے موجود کی دنیا کا امیں سمجھتا ہے:

رفتہ رفتہ شہر کی ان پُرکشش گلیوں میں چل کر درد کو اُس خود کلامی میں سمویا،

بات کرنے کی لگن سے بات نکلی، گفتگو جو بس برائے بیت ہے،

اپنی آنکھوں سے یہ آنسو پونچھ دو۔۔۔ کہ یہ موتی رفاقت کے امیں ہیں (۲۶)

دراصل یہ نظم یادوں کا ایک گہرا رشتہ لیے ہوئے تہ در تہ مختلف کیفیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ عبدالرشید نے خوب صورت علامتوں اور تمثالوں سے نظم میں ایک تجریدی منظر بنا کر پیش کیا ہے۔ عبدالرشید نے عام روایت سے ہٹ کر اپنے محسوسات کو بالکل ایک نئے آہنگ سے بیان کیا ہے اور اس کی جمالیاتی خوب صورتی کو متاثر نہیں ہونے دیا بلکہ اُن کی اندرونی کسک نے جمالیاتی پیرائے کو بڑھاتے ہوئے نظم کو پُر آہنگ بنا دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ ماضی اور حال کے رشتۂ انضباط نے نظم کی حسیاتی سطح کو مزید بلند کر دیا ہے۔

عبدالرشید کا عمومیت سے انفرادیت کی طرف سفر ان کی نظم گوئی کا ایک اہم حوالہ ہے۔ چناں چہ ان کی نظموں کو اُصولِ توقیت کے اعتبار سے اور تاریخی ترتیب میں پڑھتے ہوئے قاری حیرت میں مبتلا نہیں ہوتا یا ورطۂ حیرت میں غوطہ زن نہیں ہوتا بلکہ اس عمیق احساس اور گہرائی و گیرائی کی کیفیات سے خود کو منسلک پاتا ہے جو سال ہا سال کی ریاضتِ شعری اور برسوں کے معاشرتی، تاریخی اور انسانی تجربات کے بعد کئی ایک لحاظ سے گُندھے ہوئے تخلیقی تجربے اور رچاؤ سے بھرپور مشاہدے سے گزرتے ہوئے اس پر جادو کی طرح اپنا طلسم طاری کرتی ہیں۔ عبدالرشید کی نظم بڑی حد تک روایتی طرز سے مختلف، منفرد اور جُداگانہ طرز کی غمازی کرتی ہوئی اپنا

CC BY

سراپا دکھاتی ہوئی ایک بالکل نئی صورتِ حال کی حامل نظم ہے۔ اس کے متعدد اسباب و علل ہیں مگر ایک بالکل سامنے کا سبب عام ادبی ڈگر سے ہٹنے کا بھی ہے اور ایک تخلیق کار کا ذاتی میلان اور تخلیق کار کے ذاتی رُجحانات کو بھی ایک سبب قرار دینا زیادہ قرینِ انصاف اور موزوں ہو گا۔ ایک عنصر یہ کہ وہ فوری طور پر وقوع پذیر ہونے والے سانحات سے تاثر لے کر نظمیں تخلیق کرنے والے تخلیق کار نہیں ہیں۔ اُن کی نظموں کے مطالعہ سے اِس امر کے شواہد بھی نہیں ملتے۔ وہ سانحاتی نوعیت کے حامل واقعات کو احساس کی بھٹی پر تپانے کے بعد نظم تخلیق کرنے والے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عمومی شعری روایت کے شاعر نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ وہ عالم گیریت کے سیاق و تناظر سے مکمل طور پر آگاہ تخلیق کار ہیں۔ عبدالرشید صاحب نے انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ یوروپی ادب کو انگریزی تراجم کے توسط سے عمیق نظری سے پڑھ رکھا تھا۔ وہ یورپی اور امریکی ادب سے بھی بڑی حد تک آگاہ تھے۔ اُنھوں نے لاطینی امریکی، اور افریقی تخلیق کاروں کا بھی انگریزی تراجم کے وسیلے سے مطالعہ کیا ہوا تھا اور اُن کا مطالعہ انجذاب کی کیفیت کی حد تک وسیع تھا۔ اُنھوں نے اپنی تخلیقات کے لیے زندگی کے حقائق کی نہ صرف بازیافت کی تھی بلکہ ہستی کی نئی راہوں، زندگی کی نئی جہات اور سوسائٹی کے متعدد نئے پہلوؤں کی تلاش و بِسیار کر کے، اپنے جہانِ تخلیق کو آباد کیا ہوا تھا۔ اُنھوں نے اپنی نظم میں نئے استعارات، نئی تشبیہات، نئے علاماتی نظام کی اپنے مخصوص انداز میں تخلیق کر کے اپنی نظموں میں نئے مفاہیم پیدا کیے، ان کی نظموں میں نئی استعارہ سازی اور نئی علامات کے تخلیقی عمل کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ وہ نامانوس اور اجنبی مماثلتوں اور پیچیدہ نسبتوں کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنا کر اپنے قاری کے لیے ادق صورتِ حال ضرور پیدا کرتے ہیں کہ اُن کی تخلیقات کا قاری اپنے حصے کا ہوم ورک ضرور کرے۔ اُن کی تخلیقات میں یوروپی شعرا سے کسبِ فیض کے حوالے سے یہ کہنا بہت مشکل ہو گا کہ وہ کون سے یوروپی شاعر سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اس کے زیرِ اثر اُسی کے رنگ میں انھوں نے نظمیں کہی ہیں۔ اُن کی نظموں کے گہرے مطالعہ سے محسوس کرنا مشکل نہیں ہے کہ وہ اپنے رنگ کے منفرد تخلیق کار ہیں۔ اُن کی شاعری میں متخیلہ اپنے ترفع پر محسوس ہوتا ہے اور غنائی انداز اُن کی نظموں میں نغمگی اور دلسوزی و دلکشی کو جنم دیتا ہے۔ اُن کی نظموں کے متعدد اوصاف میں سے ایک وصف اُن کی شاعری میں موسیقیت کا چوکھا رنگ اور خیالات کو غنائیت کے ساتھ پیش کرنے کا انوکھا اور منفرد اندازِ تخلیق ہے جو اُنھیں اپنے معاصر تخلیق کاروں سے جُدا کرتا ہے۔ شاعر کا منصب محض خیالات ہی کو نظم کے قالب میں ڈھالنا نہیں ہوتا بلکہ اُسے نئے غنائی پیرایے بھی متشکل کرنے کا وظیفہ انجام دینا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں عبدالرشید نہ صرف کامیاب دکھائی دیتے ہیں بلکہ اپنی انفرادیت پر بھی استقرار و اصرار کا استحقاق محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنے شعری وظائف سے گزران کرتے ہوئے متنوع آہنگ و انداز تخلیق کیے ہیں اور یہی وہ وصفِ خاص ہے جو عبدالرشید کی نظموں کو ایک نیا انداز عطا کرتا ہے اور اس میں بھی انھیں اپنے منفرد اسلوب، اسٹائل، موضوعات کی بُنت پر مکمل دست رس حاصل ہے۔ ''انی کنت من الظالمین'' میں ان کا غنائی پیرایۂ اظہار اور منفرد آہنگ اپنے ارتفاع پر نظر آتا ہے۔

CC BY

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ادارہ اردو اکادمی: اردو نظم ۱۹۶۰ء کے بعد، دہلی، اردو اکادمی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳

۲۔ سروری، عبد القادر، جدید اردو شاعری، لاہور، کتاب منزل، ۱۹۴۶، ص ۲۸۹

۳۔ افتخار جالب: (دیباچہ) "ماخذ"، لاہور، مکتبہ ادبِ جدید، بار اول،، ص ۲۹

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: نئی تنقید، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۵ء ص ۸۵

۵۔ عبد الرشید: انی کنت من الظالمین، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، بار دوم، ۲۰۱۱ء، ص ۹

۶۔ ایضاً،، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰

۷۔ ایضاً، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۵

۹۔ ایضاً،، ص ۱۶

۱۰۔ ایضاً،، ص ۱۷

۱۱۔ ایضاً،، ص ۳۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۳۔۳۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۶۔۴۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۹۔ ایضاً، ۴۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۹

۲۱۔ ایضاً، ۵۰

۲۲۔ نئی تنقید،، ص ۸۵

۲۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر: شاعری کی سیاسی و فکری روایت، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۳ء ص ۶۳

CC BY

۲۴۔ انی کنت من الظالمین، ص۵۵۔۵۶

۲۵۔ ایضاً، ص۵۸

۲۶۔ ایضاً، ص۵۸

CC BY